ہمچو ادھم بحرِ حق بایک پیالہ جستہ اَم　　مثلِ قرنی دُرِّ دیگر را تلاشے کردہ اَم

در شبیہم بر دیارت نسبتے آوردہ اَم　　بہر اُمت تحفہ نورِ جمالت بُردہ اَم

دُرِ عینی

حیات قبلہ باباعبید اللہ دُرانی مدظلہ العالیٰ

باب ۱

نزولِ کوکب "دریۃ"

یہ دنیا کا عجائب خانہ۔ یہ پیدائش و زیست و موت کی داستانیں۔ مگر اس سے قبل وہ ظہور سے پہلے کی حیات۔ وہ یومِ ازل۔ وہ انفرادی روحوں کا اکٹھا ہونا۔ وہ میثاقِ ازل۔ وہ کون سی حیات تھی۔ یہ حیاتِ عالم سے بہت پہلے کی بات۔ کروڑوں سال پہلے کی بات۔ پھر وجودی دنیا میں آنے سے پہلے وہ طویل انتظار۔ منشائے قدرت، نظامِ فطرت کی تمام حکمتوں کی روشنی میں ہر روح کو اپنے اپنے زمانے میں یہ دنیوی زندگی گزارنے کے لئے منتخب کیا جانا۔ ہر ذی روح پر یہ احسان کہ اسے کارزارِ عالم میں وجودی زندگی گزارنے کے لئے ستر اسی سال یہ بوجھ اٹھانے کے قابل گردانا گیا۔ بذات خود ایک شکریہ وجود اور احسان کی بات تھی۔ پھر اس دنیوی زندگی کی چکی میں سے گزر کر پھر سرخرو ہو کر اپنے رب کے حضور پہنچنا۔ پھر وہی انتظارِ مدت بسیار۔ یوم حشر اس دنیا میں ہو یا وہاں۔ اور پھر اس کے بعد بھی لامتناہی زندگی کا سلسلہ۔ اور وہاں سے دنیا کے کاروبار میں، اس زندگیٔ روحانی کے ذریعہ بھی فیضان و رحمت کے اجراء کا ذریعہ بنے رہنا، خوش نصیبوں کے لئے ضروری ہوا تو ازل سے ابد تک کی زندگی کا شمار کیا جائے تو یہ دنیاوی زندگی ایک عجیب احسانِ عظیم ہے فرد کے لئے بھی اور انسانیت کے لئے بھی جس کے درمیان ایک کوکب "دریہ" کا نزول ہو۔

پیدائش اور موت کے توہمات سے قطع نظر دیکھا جائے تو جو زندہ روح اس دنیوی وجود میں آئی۔ جسم کے پنجرہ میں کچھ عرصہ مقید رہی اور دنیا میں اپنا کام کر کے چل دی، وہ تو بہر صورت ویسی کی ویسی آزاد نکلی جیسی کہ روزِ ازل سے تھی اور ویسی ہی آزاد، ابد تک رہے گی۔ اس کو موت کہاں۔ اس کی پیدائش کیا معنی۔ اس کی پیدائش تو یومِ ازل سے پہلے کی بات ہے۔ جن ارواح میں یہ شعورِ ازلی اس دنیوی زندگی میں قیام پکڑے ہوتا ہے وہی اس وجودی زندگی میں حق کی تلاش میں بے چین رہتی ہیں اور یہی تڑپ، یہی تلاش بالآخر ان کی وجودی زندگیوں میں بھی شمع کے سوز یا پارے کی بیقراری کی طرح قائم و دائم رہتا ہے۔ یہ شعورِ ازلی قبلہ درّانی صاحب کو بھی فطری طور پر نصیب ہے۔ کتنی پیاری اور کیف آور بات ہے کہ اپنی وجودی پیدائش کو خود ان کی روح دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے بچپن میں بھی بڑی سادگی سے اپنی والدہ سے دریافت کیا تھا کہ اماں یہ کیا بات تھی کہ جب میں پیدا ہو رہا تھا تو اپنے کو پیدا ہوتے بھی گھر کے آنگن کے، لابنی لابنی پھلیوں والے گل مہر کے درخت پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ اب بھی جب قبلہ درّانی صاحب یہ بات دہراتے ہیں تو اس میں وہ جذب، وہ لطافت وہ صداقت ہوتی ہے کہ ہر سادہ دل انسان یہ محسوس کر سکتا ہے کہ جیسے یہ کیفیت اس پر سے بھی گزری ہے اور وہ بھی اسی طرح، کسی گوشہ میں کھڑا یا درخت پر بیٹھا خود اپنی پیدائش کو بھی اسی طرح دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھنا روح کی بصیرت کی بات ہے۔ روح

زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ خود اپنے ظاہری وجود سے حجاب بنی، جسم کے پنجرہ میں زندگی کی محرک قوت بنی ہوئی ہے۔ جان تک کو، اپنے وجود میں کوئی کیسے دیکھے۔ پھر روح جو جانِ جاناں کی بات ہے۔ شعور کی گرفت میں کیسے آئے۔

اس ادراکِ روح کی ایک اور واردات بچپن کے زمانہ میں ہی کچھ ایسی سادگی اور اس انداز میں ہوئی کہ حق کی جانب رجوع کا یہی اہم پہلو بن گئی۔ یوں اکثر مشاہیر کی سوانح حیات میں ایک نہ ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہونے کی مثالیں ملتی ہیں جس کے بعد سے ان کی زندگی کو ایک نیا رخ ملتا ہے۔ عموماً یہ ایک دل کی چوٹ ہوتی ہے یا کسی سانحہ کے بعد تائب ہو کر حق کی جانب رجوع کا ذریعہ ہو جاتا ہے۔ قبلہ درّانی صاحب ابھی بارہ سال کے تھے۔ جوانی پہلی پھُریری لے رہی تھی۔ ایک حقیقت بیں کی نگاہ میں یہ روح کی ازلی بے چینی، اپنے اصل سے ملاقات کی تڑپ ہوتی ہے جس کا ظل خاکی بدن پر پڑتا ہے اور وہ کسی نامعلوم شے کی تلاش، کسی حسن پوشیدہ کی دید کی تڑپ میں، خود اپنے باطن کی لطافتوں کے محرک نمود میں الطف بنا ہوتا ہے۔ مجردات سے روشناسی کا یہ لڑکپن ایک فطری زمانہ ہوتا ہے۔ والد صاحب کو باغبانی کا شوق تھا۔ ایک گملہ میں صدف کا پودا تھا جس پر ایک لانبا موٹا کیڑا بیٹھا تھا۔ اتوار کا دن تھا نو بجے صبح کا وقت اور گرمیوں کا زمانہ۔ قبلہ اسے غور سے دیکھنے لگے کھاتا کیسے ہے، چلتا کیسے ہے، پھر اس کا رنگ بالکل سبز۔ جیسا پتہ کا رنگ ویسا ہی اس کیڑے کا۔ آدھ گھنٹہ اسی انہماک میں گزر گیا۔ پھر ٹھپا۔ پَر نکلے۔ پر پھیلتے گئے۔ دھوپ میں پر سوکھے کیڑے نے پَر پھیلائے اور تتلی بن کر اُڑ گیا اور ساتھ قبلہ کے قلب و دماغ پر یہ نقش چھوڑ گیا کہ ہمارے جسم کے خول کے اندر، روح کی تتلی موجود ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ یہ پھٹ کر اڑے تو ہمیں کسی اور زمان میں بڑی آزادی مل سکتی ہے۔ روح کی یہ بسیط فضائوں میں پھیل جانے کی تڑپ کتنی سادگی اور لطافتوں میں جوانی کی پہلی پھریری کی شکل لے کر ہر انسان کو نصیب ہوتی ہے۔ مگر وہ جسم کی بے قراری کی حد تک ہی محدود رکھ کر زندگی گزار لیتا ہے اور یہ موقع کھو بیٹھتا ہے۔

مگر اس لڑکپن کی منزل سے پہلے تو ہر ذی روح کے لئے وہ جسمانی پیدائش ہے جس کے لئے یوم ازل سے ہر ایک کو اپنی اپنی باری۔ اپنے اپنے زمانہ کا منتظر رہنا ہوتا ہے۔

۴ مئی یوم شنبہ، ۱۱ بجے دن ۱۹۰۶ء یہ روح سعید ازلی اس دنیا میں بھیجی گئی۔ مدارس کی ایک خوبصورت سی چھوٹی بستی، راجمندری، گنتور میں پیدائش ہوئی۔

خاندان نجیب الطرفین، مسلمانوں کا دکھ درد اپنانے والا۔ نجی زندگیوں میں راست باز، حق پرست، صداقت کا پیکر، شرافت کی تصویر۔ ہر لحاظ سے ایک اسلامی تہذیب، اخلاق اطوار سے مرصع، باعمل، خاندانِ دُرانی۔ احمد شاہ ابدالی کی فتوحات کے بعد، طول و عرض ہندوستان میں، فاتحین اپنی درخشندہ قسمتیں لے کر پہنچے۔ قبلہ دُرانی صاحب کا سلسلۂ نسب براہِ راست احمد شاہ ابدالی سے جا کر ملتا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ان کے جد امجد، سردار خاں دُرانی، دہلی چھوڑ کر کھلنہ چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے جنوبی ہند کی راہ لی۔ جب وہ ریاست کوئم سے گزر رہے تھے تو وہاں کے راجہ کی اُن پر نظر پڑی، جو سردار خان کی شخصیت سے بڑا متاثر ہوا۔ اُس نے سردار خان کو اپنی ریاست میں ایک اعلیٰ عہدہ دے دیا۔ سردار خان نے نیلی پی کے راجہ کے خلاف جنگ میں انتہائی جرأت اور مہارت کا ثبوت دیا۔ ریاست کوئم کا راجہ ان کی خدمات سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے سردار خان کی شادی اپنے کمانڈر انچیف سالار مسعود دُرانی کی بیٹی سے کرادی۔ اس طرح سردار خان جنوبی ہند میں رہ پڑے۔ جہاں ان کی نسل پروان چڑھی اور پھلی

پھولی۔ درانی صاحب کے والد خان بہادر محمد حبیب اللہ خان درانی اپنے عہد کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ والدہ اور دادی صاحبہ حضرت بندہ نوازؒ گیسو دراز کے خاندان سے تھیں۔ والدہ صاحبہ سیدہ محمود النساء کا خاندان کا کی ناڈامیں تھا۔ تقویٰ، پرہیز گاری، عبادت وریاضت میں یہ لوگ اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ شادی کے بعد بھی والدہ صاحبہ کی یہ حالت رہتی کہ خاموش زندگی گزارتیں۔ اکثر وقت گھر کے کام کاج سے فرصت پاکر عبادت اور تلاوت میں گزارتیں۔ کھانے پینے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بسا اوقات یہی معمول رہتا کہ صبح ایک کپ چائے، شام ایک کپ۔ صرف زچگی کے دنوں میں ایک وقت کا کھانا کھاتیں۔ گیارہویں شریف کی نیاز بڑے اہتمام سے کرتیں۔ ہر ماہ گیارہویں کو ہرے کپڑے پہنتیں۔ پلائو اور میٹھا تقسیم کراتیں۔ عام طور سے چھت پر جاکر عبادت کرتیں۔ ایک روز صبح کو جاء نماز پر لیٹی تھیں، چہرہ چمک رہا تھا فرمایا حیرت انگیز تماشہ دیکھا، ایک نور، زمین سے آسمان تک منور ہوگیا۔ چار بزرگ تشریف لائے پیران پیر، خواجہ اجمیری، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور ایک اور۔ فرمایا مانگ کیا مانگتی ہے۔ والدہ صاحبہ کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی اور وہ اوپر چلے گئے۔

خان بہادر محمد حبیب اللہ خاں درانی ۱۸۹۵ء میں گریجوئیٹ بن کر تعلیم سے فارغ ہوئے اور سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ ۱۹۱۱ء میں وہ ڈپٹی کلکٹر بن گئے۔ جن دنوں وہ گنتور، مدارس میں متعین تھے۔ انہوں نے مقامی مسلمان آبادی کی فلاح وبہبود کے لئے ایک انجمن کی بنیاد رکھی اور اس کے صدر منتخب کئے گئے۔ مسلمانوں کو اُن کی غربت کی وجہ سے اُس علاقہ میں حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی لئے خان بہادر کے دل پر یہ بات شاق گزرتی تھی اور انہوں نے اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ مسلمانوں کی فلاح کے لئے صرف کرنا شروع کیا۔ ان کا فرمانا تھا کہ میں نے بچوں کو علم دے دیا، پڑھا دیا، لکھادیا۔ ان کے لئے کوئی جاگیر نہیں چھوڑوں گا۔ نہ پیسہ چھوڑوں گا جس کی زیادہ ضرورت نادار قوم کو ہے۔ چنانچہ ان کی ذاتی کوششوں سے شہر میں انجمن کے دفتر کے لئے یک خوبصورت عمارت تعمیر ہوئی۔ اس عمارت میں عبادت کے لئے ایک وسیع کمرہ موجود تھا اور چند گودام بھی تھے جن سے ماہانہ ڈھائی سو روپیہ کرایہ کی صورت میں وصول ہوتا تھا۔ انجمن کے پاس ایک سو ایکڑ قابل کاشت بھی تھی۔ خان بہادر صاحب کی کوشش سے ہی ایک عید گاہ تعمیر ہوئی، قبرستان کی چار دیواری بنوائی گئی۔ مسجد کے نیچے دکانوں کی آمدنی سے مسلمانوں کی مدد کی جاتی رہی۔ طالب علموں کے وظائف مقرر تھے، ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ کئی ایک نادار ذہین طلباء تعلیم حاصل کرکے انجینئر اور جج بنے اور دوسرے باوقار عہدوں پر فائز ہوئے۔ خان بہادر صاحب کی پوری زندگی ایسے ہی فلاحی کاموں میں گزری۔ انہوں نے اپنے تعینات ہونے کے مقامات پر ہر جگہ مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے فرائض کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔

ان کی سماجی اور دینی خدمات کی بناپر ترچناپلی کے نواب صاحب نے انہیں حکومت سے مانگ لیا۔ پن گان پلی میں وہ دو سال تک ریاست کے دیوان رہے۔ خان بہادر صاحب کی نجی زندگی تقویٰ اور نیک مزاجی کا نمونہ تھی۔ تہجد اور تلاوت روزانہ کا معمول تھا۔ دفتر کے کاموں کے علاوہ فلاحی کاموں میں برابر مصروف رہتے۔ کتب بینی سے خاصہ شغف رکھتے چنانچہ ہندوستان کی کئی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے جن میں عربی، فارسی، اردو، تلگو، اوڑیہ، انگریزی قابل ذکر ہیں۔ خان بہادر صاحب کی اولادیں پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئے جن کے خاندان ان ہی کی نیک عملی اور دعائوں کے طفیل دنیا میں بھی پھل پھول رہے ہیں اور عاقبت کی بھی دولت سمیٹ رہے ہیں نیکی کے بیج سے جو درخت پیدا ہوتا ہے اس کی بار آوری دیکھنا ہو تو اس خاندان پر آج بھی نظر ڈالی جائے کہ کس طرح پھل پھول رہے ہیں۔ خان بہادر صاحب کی اولاد کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

مطہر النساء۔ رحیم النساء۔ محمد مجیب اللہ خان۔ محمد عزیز اللہ خان۔ محمد نصر اللہ خان۔ محمد عبید اللہ خان (ہمارے درانی صاحب)۔ وحیدہ خانم۔ مسعودہ خانم۔ محمد عبد المنان خان۔

خان بہادر محمد حبیب اللہ خان، بابا تاج الدینؒ ناگپوری کے معتقد تھے۔ اکثر بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور حضور سے پگڑی بھی عطا ہوئی تھی۔ اس کرم نوازی کا صدقہ تھا کہ خان بہادر صاحب کو ان کے علاقے کے لوگ ہمارے حضرت کے لقب سے پکارتے تھے اور جب خان بہادر صاحب کا انتقال ہوا تو نماز جنازہ اور فاتحہ چار گائوں میں ہوئی جگہ جگہ غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور قرآن خوانی ہوئی۔

اس طرح گویا زمین درست کی جاچکی تھی۔ فرش آراستہ تھا، محفل جم چکی تھی جس میں ایک کوکبِ دریہ کا نزول ہوتا۔ جب ساری کائنات کے درخشندہ نظام کی ربوبیت اُسی قادرِ مطلق کے ہاتھ ہے تو اس کا وجودی اظہار نت نئے اندازمیں ہوتا ہی رہتا ہے، جس کو ایک سوجھ بوجھ رکھنے والی آنکھ صاف طور پر دیکھ لیتی ہے۔ چنانچہ قبلہ کی پیدائش کے وقت والدہ صاحبہ بہت بیمار تھیں۔ نوزائیدہ بچہ کے لئے ماں کا دودھ بھی مشکل سے ہوتا۔ گھر کی ملازمہ سیدو اور اس کا میاں پنٹو عرصہ سے گھر کی خدمت کرتے آرہے تھے۔ سیدو کے ذمہ ہی تھوڑی بہت دیکھ بھال بچہ کی پڑی۔ سیدو کا اپنا بھی نوزائیدہ بچہ تھا اس لئے سیدو کے توسط سے قدرت نے دودھ کا بھی انتظام کر دیا۔ قبلہ کی پیدائش کے دو دن بعد ہی سیدو کا بچہ اکیس دن کی عمر پا کر وفات پا گیا۔ سیدو پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مگر اس نوزائیدہ بچہ کی جانب فطری کشش نے سیدو کا یہ غم فوری طور پر ہی غلط کر دیا اور اس نے بہ رضا و رغبت قبلہ کو دودھ پلانے کی ذمہ داری خود ہی لے لی۔ اس طرح ڈھائی سال تک قبلہ نے سیدو کا دودھ پیا اور جسم کافی تندرست ہو کر گول گپا ہو گیا۔ قدرت نے اس طرح جہاں سیدو کا صدمہ دور کرایا وہاں ایک بیمار ماں کے ہوتے ہوئے ایک نوزائیدہ جسم کی پرورش کا بھی انتظام کر دیا۔ اور دو مائوں کے جذبۂ مادریت کو بھی سکون بخشا۔ ایک نظر تشکر سے دیکھا جائے تو جیسے قدرت کا سارا کارخانہ ایک ہی وحدتِ وجود اور ایک ہی ربوبیت کی شان میں کارفرما ہے۔ ایک زندگی دوسری زندگی کو جنم دے رہی ہے۔ ایک زندگی اپنے سے بہتر زندگی کے اجراء کا ذریعہ بنی ہے۔ ربوبیت عام ہے۔ اہل کی جگہ اہل تر کو مل رہی ہے۔ ارتقائے حیاتِ جسمانی و روحانی ایک کُن کے محرک کیف میں، ایک ہی رشتہ میں منسلک جاری و ساری ہے۔

قبلہ کی ابھی اڑھائی سال کی عمر ہی تھی کہ ختنہ کرادی گئی۔ قبلہ کی ہمشیرہ کا فرمانا ہے کہ جب ختنہ کی خوشی کے درمیان ماموں صاحب نے قبلہ کے بند ہاتھوں میں سونے کی اشرفی رکھی تو قبلہ نے مٹھی کھول کر دیکھی اور ''چھی گُو'' کہہ کر پھینک دی۔ اس وقت تک اظہار خیال کے لئے ٹوٹے پھوٹے الفاظ بولنے ہی لگے تھے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بچپن کا واقعہ سونے کا ٹکڑا اور دہکتا ہوا کوئلہ، پھر جبریل امین کی اعانت سے سونے کا ٹکڑا چھوڑ کر، دہکتا کوئلہ منہ میں رکھ لینا، گو عمر بھر زبان میں لکنت آجانے کا سبب بنا مگر اس وقت کے فرعون کے ظالمانہ حکم سے جان بچنے کی صورت بھی ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر بیدار روح کی استعانت قدرت خود کر رہی ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی تو کفار کی پیشکش کو یہی کہہ کر ٹھکرایا تھا کہ میرے ایک ہاتھ میں تم سونے کا پہاڑ اور دوسرے میں چاند رکھ دوگے تب بھی اپنے عزم سے نہ ہٹوں گا۔ یہ دین، دنیا میں سے دین کو منتخب کرنا اور دنیا کو ٹھکرانا ہر بلند مرتبت روح کا شیوہ رہا ہے اور یہ نشانی اس بات کی ہے کہ ان سونے کے ٹھکرانے والوں کے ہاتھوں یقیناً انسان نے زر پرستی سے نجات پائی ہے۔ سونے کا بچھڑا اکثر اسی طرح پاش پاش کیا گیا ہے۔ زر پرست قومیں ایسی زندہ روحوں کے ہاتھوں ہی سرنگوں ہوئی ہیں۔ کچھ اسی قسم کی تکرار کا ایک اور واقعہ بڑی بوجان نے بیان کیا وہ یہ کہ جب قبلہ کی عمر چھ سال کی تھی تو ایک زمانہ میں گھر میں روپیہ پیسہ کی کمی تھی۔ بڑی بوجان نے قبلہ صاحب سے کہا تھا کہ عبید تم دعا کرو۔ اس پر قبلہ نے جھنجھلا کر ان سے کہا تھا کہ یہ کیا ''گُو گند'' مانگتی رہتی ہیں۔ قبلہ جب چار سال کے تھے تو اس زمانہ میں ایک

مولوی صاحب گھر میں رہا کرتے تھے جو بڑی بہنوں کو درس نظامی پڑھاتے تھے۔ ایک دن یہ مولوی صاحب قبلہ کو سمندر میں نہلانے کے لئے لے گئے۔ قبلہ کو آج تک اس واقعہ کی جھلک ہے کہ مولوی صاحب کے کاندھوں پر بیٹھے تھے۔ ایک بڑی موج آئی، اٹھا کر لے گئی اور پھر ساحل پر پھینک دیا۔ اس حادثہ میں قبلہ کو نہ کوئی تکلیف ہوئی، نہ بیماری۔ جیسے ایک بچانے والا ہاتھ بھی ساتھ تھا۔ کوئی غیریت نہ اپنے جسم میں تھی، نہ موج میں، نہ سمندر میں۔ یہ احساس قبلہ کو آج بھی ہے۔ جیسے ساری کی ساری زندگی، سب کچھ، ایک ہی تموجِ حیات ہے۔ ایک ہی بحر حقیقت کا قطرہ یہ انسان بھی ہے۔ سمٹے تو قطرہ ہے پھیلے تو سمندر ہے۔ یہ بھی ایک پُر لطف بات ہے کہ بڑے ہو کر جب یوں ہی کسی جوتشی کو ہاتھ دکھایا تھا تو اُس نے زائچہ نکال کر یہ بتایا تھا کہ تم ضرور ڈوبے ہو گے مگر بچ گئے ہو گے۔

قبلہ درانی صاحب کی پیدائش سے آنکھوں میں ایک چمک آئی تھی۔ پلک مارتے تو آنکھوں کے کونے جگنو کی طرح چمکتے۔ والد صاحب نے بھی فرمایا تھا کہ قسمت والا ہو گا۔ مشہور ہو گا۔ بچپن دادی صاحبہ کے ساتھ گزارا۔ دادی کے پاس ہی سوتے تھے۔ دادی کے انتقال کے بعد ایک خاموشی سی لگ گئی۔ بچپن میں یہی کچھ خاموشی طبیعت میں رہی۔ بچوں سے نہ تو کبھی لڑتے، نہ ان کو مارتے، نہ اگر وہ مارتے تو کسی سے شکایت کرتے۔ ایک خود اعتمادی کی شانِ بے نیازی میں پروان چڑھ رہے تھے۔

اسی بچپن کے زمانے میں ایک دو سالہ بچہ کی دیکھ بھال میں خاص دلچسپی لیتے رہے اس کا باپ اس بچہ اور اس کی ماں کو بے آسرا چھوڑ کر چل دیا تھا۔ یتیمی کی سی حالت میں یہ چھوٹا بچہ کس کا سہارا ڈھونڈتا۔ گھر کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے تو اس بچہ کی تنہائی کو وہی محسوس کر سکتا تھا جو خود ازلی تنہائیوں سے آشنا ہو۔ قبلہ درانی صاحب کی ذات میں اس بچہ کو ایک شفیق ساتھی بھی مل گیا تھا اور بڑا بھائی بھی۔ قبلہ کی خود اپنی پرورش اور بیماریوں کے زمانے میں دیکھ بھال ان کی بڑی بہن صاحبہ مطہر النساء نے اس دردِ دل سے کی کہ ان کو قبلہ اماں کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ دوسروں کے لئے وہ بڑی بُوجان کے نام سے اب بھی پکاری جاتی ہیں۔ عبادت، ریاضت، نذر نیاز سے اب بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔ اور خلوص و محبت کی تصویر ہیں۔ یہی حال قبلہ کے تمام بھائیوں اور بہنوں کا ہے۔ سب ہی محبت والے، پُر خلوص، ایک عظیم خاندان کی یادگار ہیں۔ نمازی، پرہیز گار، پارسا۔ دنیا کے کاموں میں بھی ید طولیٰ رکھنے والے۔ دین دنیا کو توازن میں لئے زندگی گزارنے والے۔

کھانے پینے سے قبلہ کو زیادہ شوق نہ تھا لیکن خصوصیت ضرور تھی ان کی پسند اور فرمائش میں۔ چنانچہ سادہ چاول کی جگہ پلائو پسند تھا اور آم کا شوق کبھی کبھی یہ صورت بھی اختیار کرتا کہ رات کو ایک بجے آپا سے منگوا کر تھوڑا سا کھا لیتے۔ عام طور سے کھانے میں ایک ہی چیز کھانا پسند کرتے اور یہی شعار تمام زندگی اپنایا۔

☆...☆...☆